گمنام خطوں میں گالیاں

جب یہ مقدمہ داخلِ دفتر ہوگیا ایک مدت کے بعد لوگوں نے مرزا کے نام گمنام خط متضمن سب وشتم بھیجنے شروع کئے۔ جن میں شراب نوشی اور بد مذہبی وغیرہ پر سخت نفریں اور طعن وملامت لکھی ہوتی تھی۔ اُن دنوں میں مرزا کی عجب حالت تھی؛ نہایت مکدر اور بے لطف رہتے تھے۔ اور جب چٹھی رساں ڈاک لیکر آتا تھا تو۔ اس خیال سے کہ مبادا کوئی اسی قسم کا خط نہ آیا ہو۔ اُن کا چہرہ متغیر ہوجاتا تھا۔ اتفاق سے اُنھیں دنوں میں نواب مصطفٰے خاں مرحوم کے ہمراہ میرا دلی میں آنا ہوا۔ چونکہ مجھکو ان نالائق گمنام خطوں کے آنے کا حال معلوم نہ تھا؛ ایک روز مجھسے ایک ایسی غلطی ہوگئی جس کے تصور سے مجھکو ہمیشہ نہایت شرمندگی ہوتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مذہبی خود پسندی کے نشے میں سرشار تھے۔ خدا کی تمام مخلوق میں سے صرف مسلمانوں کو، اور مسلمانوں کے بہتر فرقوں میں سے اہلِ سُنت کو، اور اہلِ سُنت میں سے صرف حنفیہ کو، اور اُن میں سے بھی صرف اُن لوگوں کو جو صوم وصلوۃ اور دیگر احکامِ ظاہری کے نہایت تقید کے ساتھہ پابند ہیں؛ نجات اور مغفرت کے لائق جانتے تھے۔ گویا دائرۂ رحمتِ الٰہی کو کوئن وکٹوریا کی وسعتِ سلطنت سے بھی۔ جس میں ہر مذہب اور ملت کے آدمی بہ امن وامان زندگی بسر کرتے ہیں۔ زیادہ تنگ اور محدود خیال کرتے تھے۔ جس قدر کسی کے ساتھ محبت یا لگاؤ زیادہ ہوتا تھا اُسی قدر اس بات کی تمنا ہوتی تھی کہ اُسکا خاتمہ ایسی حالت پر ہو جو ہمارے زعم میں نجات اور مغفرت کے لئے ناگزیر ہے۔ چونکہ مرزا کی ذات کے ساتھ محبت اور لگاؤ بدرجۂ غایت تھا اس لئے ہمیشہ اُنکی حالت پر افسوس آتا تھا۔ گویا یہ سمجھتے تھے کہ روضۂ رضواں میں ہمارا اُن کا ساتھ چھوٹ جائیگا؛ اور مرنے کے بعد پھر اُن سے ملاقات نہوسکیگی۔ ایک روز مرزا کی بزرگی اُستادی، اور کبرسنی کے ادب اور تعظیم کو بالائے طاق رکھکر خشک مغزواعظوں کی

طرح اُنکو نصیحت کرنی شروع کی۔ چونکہ اُن کا ثقلِ سماعت انتہا کے درجے کو پہونچ گیا تھا، اور اُن سے بات چیت صرف تحریر کے ذریعے سے کیجاتی تھی۔ نمازِ پنجگانہ کی فرضیت اور تاکید پر ایک لمبا چوڑا لکچر لکھکر اُن کے سامنے پیش کیا۔ جسمیں اُن سے اِس بات کی درخواست تھی کہ آپ کھڑے ہوکر، یا بیٹھکر، یا ایما واشارے سے؛ غرض جس طرح ہوسکے نمازِ پنجگانہ کی پابندی اختیار کریں۔ اگر وضو نہ ہوسکے تو تیمم ہی سہی مگر نماز ترک نہو۔

مرزا کو یہ تحریک سخت ناگوار گذری؛ اور ناگوار گذرنے کی بات ہی تھی۔ خصوصاً اِس وجہ سے کہ اُنھیں دنوں میں لوگ گمنام خطوں میں اُنکے اعمال وافعال پر بہت ناز یبا طریقے سے نفرین وملامت کررہے تھے، اور بازاریوں کی طرح کھلم کھلا گالیاں لکھتے تھے۔ مرزا صاحب نے میری لغو تحریر کو دیکھکر جو کچھ فرمایا وہ سُننے کے لائق ہے۔ اُنھوں نے کہا "ساری عمر فسق وفجور میں گذری؛ نہ کبھی نماز پڑھی، نہ روزہ رکھا، نہ کوئی نیک کام کیا۔ زندگی کے چند انفاس باقی رہگئے ہیں؛ اب اگر چند روز بیٹھکر، یا ایما واشارے سے نماز پڑھی؛ تو اس سے ساری عمر کے گناہوں کی تلافی کیونکر ہوسکے گی؟ میں تو اِس قابل ہوں کہ جب دم نکلے، میرے عزیز اور دوست میرا مُنھ کالا کریں، اور میرے پاؤں میں رسّی باندھکر شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں، اور پھر شہر سے باہر لیجاکر کتّوں، اور چیلوں، اور کوّوں کے کھانے کو (اگر وہ ایسی چیز کھانا گوارا کریں) چھوڑ آئیں۔ اگرچہ میرے گناہ ایسے ہی ہیں کہ میرے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کیا جائے؛ لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحّد ہوں۔ ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں "لا الٰہ الا اللہ"، "لا موجود الا اللہ"، "لا موثر فی الوجود الا اللہ"۔

شاید اُسی روز جب کہ یہ گفتگو ہوچکی تھی اور مرزا صاحب کھانا کھارہے تھے۔ چٹھی رساں نے ایک لفافہ لاکر دیا۔ لفافہ کی بے ربطی اور کاتب کے نام کی اجنبیت سے اُنکو یقین ہوگیا کہ یہ کسی مخالف کا

ویسا ہی گمنام خط ہے جیسے پہلے آچکے ہیں۔ لفافہ مجھکو دیا کہ اسکو کھولکر پڑھو۔ میں جو دیکھتا ہوں تو فی الحقیقت سارا خط فحش ودشنام سے بھرا ہوا تھا۔ پوچھا کس کا خط ہے؟ اور کیا لکھا ہے؟ مجھے اُسکے اظہار میں تأمل ہوا۔ فوراً میرے ہاتھ سے لفافہ چھین کر فرمایا کہ شاید آپ کے کسی شاگرد معنوی کا لکھا ہوا ہے۔ پھر اوّل سے آخر تک خود پڑھا۔ اُس میں ایک جگہ ماں کی گالی بھی لکھی تھی۔ مُسکرا کر کہنے لگے کہ "اس اُلّو کو گالی دینی بھی نہیں آتی۔ بڈّھے یا ادھیڑ آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں؛ تاکہ اُسکو غیرت آئے۔ جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں؛ کیونکہ اُسکو جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچّے کو ماں کی گالی دیتے ہیں؛ کہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یہ قرم ساق جو بہتّر برس کے بڈّھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اس سے زیادہ کون بے وقوف ہوگا؟

اسکے بعد مَیں اُن سے رخصت ہو کر چلا آیا۔ دوسرے روز حضرت نے ایک غزل لکھکر میرے پاس بھیجی۔ جس میں اگرچہ میرے نام اور تخلص کی تصریح نہ تھی لیکن اُسکے بعض مضامین اور اشارات سے معلوم ہوا کہ اُس میں جو طعن و تعریض ہے وہ میرے ہی نسبت ہے۔ غزل یہ ہے

بہ مقصدے کہ مرآں را رہِ خدا گویند   برو برو کہ ازاں سو بیا بیا گویند
کسیکہ پائے ندارد چگونہ راہ رود   خود اہلِ شرع دریں داوری چہا گویند
ز رمزِ نخل انا اللہ گوئے - ناآگاہ   حدیثِ جلوہ گہ و موسی و عصا گویند
مگر ز حق نبود شرم حق پرستاں را   کہ نامِ حق نبرند و ہمیں انا گویند
ز قولِ شاں نبود دل نشینِ اہلِ نظر   جز آں صفات کہ از ذاتِ کبریا گویند
نخواندہ در کتب و ناشنیدہ از فقہا   بغیر بے مزہ واگویہ ہا کہ وا گویند

دم از وجودک ذنب* زدند بے خبراں   چہ ساں عطیۂ حق را گناہ ما گویند
بلے! گناہ بود دعوئے وجود از ما   باہلِ راز چنیں گوئے تا بجا گویند
دگر ملا متیاں را چہ زہرہ پاسخ   اگر بہ خشم گرایند و ناسزا گویند
نکردہ زر مسِ خود را و بہرِ عرضِ فریب   بہ پیشِ خلق حکایت ز کیمیا گویند
کساں کہ دعوئے نیکی ہمی کنند - مرا   اگر نہ نیک شمارند - بد چرا گویند؟
طمع مدار کہ یابی خطابِ مولانا   بس ست ہمچو توئے را کہ پارسا گویند
بگوئے مردہ - کہ در دہر کارِ غالبِ زار   ازاں گذشت کہ درویش و بے نوا گویند

اس غزل کو دیکھکر مجھکو اس بات کا موقع ملا کہ مرزا کے کمالِ شاعری کی نسبت جو خیالات مکنونِ خاطر ہیں؛ اور کبھی اُنکے اظہار کی نوبت نہیں آئی؛ اُن کو کسی قدر شکایت کے ساتھ ایک مختصر قطعہ میں بیان کیا جائے۔ چنانچہ قطعۂ ذیل ترتیب دیکر مرزا صاحب کی خدمت میں بھیجا۔

قطعہ

تو اے کہ رونقِ پیشینیاں بہم شکست   ز نظم و نثر تو کاندر زمانِ ما گفتی
چہ نغمہ ہا کہ بہ قانونِ ذوق سنجیدی   چہ بذلہ ہا کہ بہ اندازِ دلربا گفتی

* یہ ایک مشہور قول صوفیۂ کرام کا ہے۔ میں نے جو کچھ مرزا صاحب کو لکھکر دیا تھا اُس میں ایک موقع پر یہ جملہ بھی لکھا گیا تھا۔ مرزا اُسپر اعتراض کرتے ہیں اور اُس کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ "وجود ایک عطیۂ الٰہی ہے؛ پس اُس کو ہمارا گناہ کیونکر کہا جاسکتا ہے؟ البتہ دعویٔ وجود گناہ ہے۔ اگر اہلِ راز سے اس طرح کہا جائے تو وہ تسلیم کرسکتے ہیں"۔ مگر معلوم رہے کہ جن لوگوں کا یہ قول ہے کہ "وجودک ذنب" وہ ایک وجودِ واجب کے سوا اور کسی وجود کے قائل نہیں ہیں۔ وحدتِ وجود اُن کا اصلِ اصول ہے۔ پس اُن کے نزدیک وجودِ ماسوا عطیۂ حق نہیں ہے بلکہ وہم و خیالِ انسانی کے مخترعات میں سے ہے اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ "وجودک ذنب" ۱۲

رسید نشئہ عرفاں چو ذکرِ مے راندی   شگفت خاطرِ یاراں گر از صبا گفتی

دوید ریشہ بدلہا چو حرفِ مہر زدی   دمید نخلِ تمنا چو از وفا گفتی

گہر بہ بزم فشاندی اگر ثنا خواندی   اثر ز لفظ دماندی اگر دعا گفتی

ہزار عقدۂ سربستہ باز بکشودی   ہزار نکتۂ پوشیدہ بر ملا گفتی

ز سترِ تفرقہ و جمع قصہ ہا راندی   ز سیرِ انفس و آفاق راز ہا گفتی

بر آمد از دلِ بیگانگاں ترانۂ ذوق   بہ محفلے کہ سخن ہائے آشنا گفتی

لطیفہ ہا کہ بہ لفظ و بیاں نمی گنجید   تو چوں فرشتہ ز غیب آمدی و وا گفتی

بحقِ لطفِ کلامت کہ ہست بر دلِ ما   کہ پایۂ سخن افراشتند تا گفتی

تو اے کہ ہر سخنِ نغزِ تو بدل جا کرد   جز آں کہ در حقِ حالی برمزدا گفتی

ہر آنچہ گفتۂ اندر جوابِ عرضِ نیاز   خطا بود کہ بگیرم اگر خطا گفتی

ولے بعربدہ از حرفِ چند با خویشم   کہ گر نگفتہ ام آخر تو از کجا گفتی

عجب کہ قاعدہ دانِ نیازمندی را   سفیہ و معجب و خود بین و خود نما گفتی

عجب کہ چاشنی اندوزِ خاکساری را   رہینِ ذوقِ نوا سنجیِ انا گفتی

عجب کہ منفعلے راز نقدِ ناسرہ اش   بہ زرق در گرہ و عرضِ کیمیا گفتی

نہ راہِ حرف بسویت نہ جائے من بلبت   جواب چیست اگر پرسم از کجا گفتی

اگر نہ روئے سخن با تو بود۔ می گفتم   چگونہ گفتی؟ و چوں گفتی؟ و چرا گفتی

ولیک شرطِ ادب نیست بر تو خردہ گرفت   ہر آنچہ در حقِ من گفتۂ بجا گفتی

جس زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا اُس زمانے میں مجھکو نواب محمد مصطفےٰ خاں مرحوم متخلص بہ شیفتہ و حسرتی رئیس جہانگیر آباد کے ہاں تعلق تھا، اور اُن دنوں میں وہ دلی آئے ہوئے تھے، اور میں اُنھیں کے مکان پر مقیم تھا۔ جب یہ قطعہ مرزا صاحب کی نظر سے گذرا تو اُنھوں نے چار بیت کا ایک نہایت لطیف قطعہ نواب مرحوم کے پاس لکھکر بھیجا جو ذیل میں درج ہے۔

قطعہ

تو اے کہ شیفتہ و حسرتی لقب داری   ہمی بہ لطفِ تو خود را امیدوار کنم

چو حالی از منِ آشفتہ بے سبب بخلید   تو گر شفیع نگردی بگو چہ کار کنم

دوبارہ عمر دہندم اگر بفرضِ محال   بر آں سرم کہ در آں عمر ایں دو کار کنم

یکے ادائے عبادات عمرِ پیشینہ   دگر بہ پیشگہِ حالی اعتذار کنم

اگرچہ مجھکو شرم آتی ہے کہ مرزا کے عالی رتبہ کلام کے ساتھ اپنا کم وزن و بے وقعت کلام ناظرین کے سامنے بار بار پیش کروں، مگر مقام اور موقع اس بات کا مقتضی ہے کہ جس واقعہ کا ذکر چھڑ گیا ہے اُسکو انجام تک پہونچایا جائے۔ مرزا صاحب کے اس قطعہ پر میں نے ایک اور قطعہ لکھکر اُن کی خدمت میں بھیجا جو ذیل میں لکھا جاتا ہے۔

قطعہ

تو اے کہ عذر فرستادۂ بسوئے رہی   سزد کہ جانِ گرامی بر آں نثار کنم

شکایتے کہ تراں گفت عینِ اخلاص است   گرم تو دوست شماری ہزار بار کنم

نماند قاعدۂ شکرِ بے ریا بجہاں   اساسِ دوستی از شکوہ استوار کنم

چو شکوہ جز بتقاضاے دوستی نبود | زغیر شکر و شکایت ز دوستدار کنم
سرشتِ پاک و دلِ صاف دادہ اند مرا | بحرفِ تلخ دلے خالی از غبار کنم
خوش آں کہ ساز کنم از تو شکوہ بیجا | تو اعتذار کنی و من افتخار کنم
خوش آں کہ عذرِ تو چوں در کند مرا زبیا | دگر بہ پیشِ تو تمہیدِ اعتذار کنم
براں سرم کہ اگر مرگ اماں دہد زیں پس | ز کارہاے جہاں خاصہ ایں کار کنم
ز کردہ توبہ نمایم ز گفتہ استغفار | دگر سپاسِ تو پنہان و آشکار کنم

جب یہ قطعہ مرزا صاحب کے پاس پہونچا اُسپر یہ لکھکر کہ "بس اب بیت بحثی موقوف" میرے پاس بھیج دیا اِسکے بعد پھر اور کچھ نہیں لکھا گیا۔

مرزا نے عربی میں صرف و نحو کے سوا اور کچھ اُستاد سے نہیں پڑھا تھا؛ مگر چونکہ علم لسان سے اُن کو فطری مناسبت تھی۔ اُنکی نظم و نثر اُردو و فارسی کے دیکھنے سے کہیں اِس بات کا خطرہ تک دل میں نہیں گذرتا کہ یہ شخص عربیت اور فنِ ادب سے ناواقف ہوگا۔ عربی الفاظ کو اُنھوں نے ہر جگہ اُسی سلیقے سے استعمال کیا ہے جس طرح ایک اَچھے فاضل اور ادیب کو استعمال کرنا چاہیے۔ شاعری جسکا ملکہ اُن کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ اُس سے قطع نظر کرکے فارسی زبان اور فارسی الفاظ و محاورات کی تحقیق اور اہلِ زبان کے اسالیب بیان پر مرزا کو اِس قدر عبور تھا کہ خود اہلِ زبان میں بھی مستثنیٰ آدمیوں کو ایران کے مستند شعرا کی زبان پر اِس قدر عبور ہوگا۔ اِسکے سوا فنِ عروض میں بھی اُن کو کافی دستگاہ معلوم ہوتی ہے۔ اکثر بڑے بڑے نامور شعرا کو دیکھا اور سُنا گیا ہے کہ باوجود کمال شاعری کے اِس فن سے محض ناآشنا ہوتے ہیں، اور سیدھی سیدھی بحروں کے سوا جنکے وزن اور

قول کا اندازہ صرف استقامتِ طبع سے ہوسکتا ہے۔ اور بحروں میں کلام موزوں نہیں کرسکتے۔ چنانچہ مولانا روم فرماتے ہیں "من ندانم فاعلاتن فاعلات ✤ شعر می گویم بہ از قند و نبات ✤ مرزا کا ایسا حال نہ تھا۔ چنانچہ فارسی اور اُردو میں متعدد غزلیں اور نیز ایک آدھ فارسی قصیدہ ایسی ٹیڑھی بحروں میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ اکثر موزوں طبع بغیر واقفیت عروض کے اُن بحروں میں نہیں چل سکتے۔ علمِ نجوم سے کسی قدر، اور اُسکی اصطلاحات سے پوری واقفیت اُن کو تھی۔ چنانچہ اُنکی نظم فارسی میں جا بجا اِس کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ علمِ تصوّف سے جسکی نسبت کہا گیا ہے کہ "برائے شعر گفتن خوب ست،" اُن کو خاص مناسبت تھی اور حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے اُنکے مطالعے سے گذرے تھے۔ اور سچ پوچھیے تو انھیں متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہمعصروں میں بلکہ بارھویں اور تیرھویں صدی کے تمام شعرا میں ممتاز بنا دیا تھا۔ فنِ تاریخ اور سیاق و مساحت وغیرہ سے اُن کو مطلق لگاؤ نہ تھا۔ جس زمانے میں کہ وہ خاندانِ تیموریہ کی تاریخ یعنی مہر نیم روز لکھ رہے ہیں کسی نے اُن کو مورخ سمجھکر کچھ سوالات کیے ہیں جسکے جواب میں لکھتے ہیں "میں فنِ تاریخ و مساحت و سیاق سے آشنا بیگانہ ہوں کہ ان فنون کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ کارپردازانِ دفترِ شاہی خلاصۂ حالات از روے کتب اُردو میں لکھکر میرے پاس بھیجدیتے ہیں، میں اُسکو فارسی کرکر حوالے کرتا ہوں۔ میرے ہاں ایک کتاب بھی نہیں۔ میں اسی قدر ہوں کہ نظم و نثر بقدر اپنی استعداد کے لکھ سکتا ہوں؛ مورخ نہیں ہوں"

"ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم | از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس"

مرزا کا خط نستعلیق شفیعا آمیز نہایت شیریں اور دلاویز تھا جیسا کہ اکثر اہلِ ایران کا ہوتا ہے اور باوجود خوشخطی کے نہایت زود نویس اور تیز دست تھے۔ شعر پڑھنے کا انداز بھی خاصکر مشاعروں میں حد سے

✤ لطیفہ۔ شمس العلما مولوی ذکاءاللہ سے کسی نے پوچھا کہ مرزا صاحب کو ریاضی میں بھی کچھ دخل تھا یا نہیں؟ اُنھوں نے کہا ایسا ہی دخل تھا جیسا مجھے شاعری میں ہے"

زیادہ دلکش اور موثر تھا۔ میں نے غدر سے چند سال پہلے۔ جب کہ دیوانِ عام میں مشاعرہ ہوتا تھا۔ صرف ایک دفعہ مرزا صاحب کو مشاعرے میں پڑھتے سُنا ہے۔ چونکہ آنکے پڑھنے کی باری سب کے بعد آئی تھی اس لئے صبح ہوگئی تھی۔ مرزا نے کہا صاحبو! میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں؛ یہ کہکر اوّل اُردو طرح کی غزل اور اُسکے بعد فارسی کی غیر طرح نہایت پُر درد آواز سے پڑھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدر دان نہیں پاتے: اور اس لئے غزلخوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

جس زمانے میں میر نظام الدین ممنوں شاہ صاحب کے پُرانے مدرسے میں مشاعرہ کرتے تھے ایک مشاعرے میں مرزا نے اپنا فارسی قصیدہ دریا گریستن اور تنہا گریستن جو جناب سید الشہدا کی منقبت میں اُنھوں نے لکھا تھا پڑھا۔ سُنا ہے کہ مجلس مشاعرہ بزم عزا بن گئی تھی۔ جب تک قصیدہ پڑھا گیا لوگ برابر روتے رہے: مفتی صدر الدین خاں مرحوم بھی موجود تھے اتفاق سے اُسی حالت میں مینہ بھی برسنے لگا مفتی صاحب نے کہا "آسماں ہم گریست"

اسی قصیدے کی نسبت سید اکبر مرزا خلف الصدق ناظر سید حسین مرزا مرحوم بیان کرتے ہیں کہ بندرگاہ بصرہ میں ایک جگہ مجلس عزا تھی۔ اور بارش ہورہی تھی۔ بانیٔ مجلس نے مجھسے کہا کہ تم بھی کچھ پڑھو۔ میرے پاس اُسوقت پڑھنے کی کوئی چیز مرثیہ یا کتاب نہ تھی۔ اسی قصیدے کے چند اشعار زبانی یاد تھے: میں نے وہی پڑھ دیے۔ پانچ ہی سات شعروں پر مجلس میں خوب رقت ہوئی۔ عرب، عجم، اور ہندی سب اُس مجلس میں شریک تھے۔ مجلس کے بعد ہر ایک عجمی مجھسے پوچھتا تھا کہ یہ اشعار کس شخص کے تھے بالخصوص اس شعر کی بہت تعریف کرتے رہے۔

مزد شفاعت و صلۂ صبر و خونبہا ہیچ از کسے نخواستہ الاّ گریستن

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ایک دفعہ مرزا دبیر مرحوم نے اسی شعر پر مصرعے لگائے تھے مگر اُنکو خود پسند نہ آئے اور کہا کہ جس رتبے کا یہ شعر ہے ویسے مصرعے نہیں لگ سکتے۔

مرزا کے اخلاق و عادات و خیالات

مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ایک دفعہ اُن سے مل آتا تھا اُسکو ہمیشہ اُن سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھکر وہ باغ باغ ہوجاتے تھے؛ اور اُن کی خوشی سے خوش اور اُن کے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ اسلئے اُن کے دوست ہر ملت اور ہر مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے۔ جو خطوط اُنھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں اُن کے ایک ایک حرف سے مہر و محبت و غمخواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے۔ ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمے فرضِ عین سمجھتے تھے۔ اُن کا بہت سا وقت دوستوں کے خطوں کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی وہ خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔ وہ دوستوں کی فرمایشوں سے کبھی تنگدل نہ ہوتے تھے۔ غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمایشیں اُنکے بعض خالص و مخلص دوست کرتے تھے اور وہ اُنکی تعمیل کرتے تھے۔ لوگ اُنکو اکثر بیرنگ خط بھیجتے تھے مگر اُن کو کبھی ناگوار نہ گذرتا تھا۔ اگر کوئی شخص لفافے میں ٹکٹ رکھکر بھیجتا تھا تو سخت شکایت کرتے تھے۔ اُنھوں نے میسور کے ایک شہزادے کو اپنی کوئی کتاب بھیجی ہے اُسنے کتاب کی رسید لکھی ہے، اور قیمت دریافت کی ہے۔ اُسکے جواب میں لکھتے ہیں "حرفِ پرسشِ مقدارِ قیمت چرا بزبانِ قلم رفت؛ ہنجارِ نوازشِ نیازمنداں بے نوا نہ اینست۔ بے سرمایہ ام نہ فرومایہ۔ سخنورم نہ سوداگر۔ مؤلفِ تیومشیم نہ کتاب فروش۔ پذیرندۂ عطایم نہ گیرندۂ بہا۔ ہرچہ آزادگاں بشہزادگاں فرستند نذر ست؛ و ہرچہ شاہزادگاں